محمد رفیق الاسلام
لیکچرار شعبہ اُردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، بہاول پور

پریشان جلوے: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

Muhammad Rafiq ul Islam

Lecturer Urdu Department,

Govt. Postgraduate College Bahawalpur

Preshan Jalway: Research and Analytical Study

It is impossible to gainsay the role of Bahawalpur State in the promotion of Urdu literature. No doubte,innumerable excellent books were created here."Preshan Jalway" is not only of them but also it is important because it covers the four genres of literature concurrently,i.e fiction,poetry,criticism and biography.It also contains the initial literary creations of such literaryfigures that belong to Bahawalpur,whome earned name and fame at national and transnational level.Among them Ahmad Nadim Qasmi,Cap.Shafiq ur Rehman,Dr.Shuja Namoos,Shabir Bukhari and Amin Hazeen are worth mentioning,whereas "The Introduction" written by Sir Abdul Qadir is an excellent critical analysis.In this article a research and critical study of this rare book has been done.

سابق ریاست بہاول پور میں فارسی زبان ہی زبانِ نوشت وخواند تھی۔ مگر جب ۱۸۴۸ء میں شہر بہاول پور کی بنیاد رکھی گئی تو نواب بہاول خاں اوّل نے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کو اس علاقے میں آباد ہونے کی دعوت دی۔ چناں چہ صوفیاء کرام کے علاوہ بہت سے ایسے ماہرینِ علم وفن بھی یہاں آ کر آباد ہوئے جن کی مادری زبان اُردو تھی۔ اس طرح اس علاقے میں اُردو زبان کا تعارف ہوا اور یہ اپنی حلاوت اور شرینی کی بِنا پر یہاں کے مقامی لوگوں میں جلد مقبول ہوگئی۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ امیرانِ بہاول پور نے اِسے نا صرف پسند کیا بلکہ اس کے فروغ کے لیے بھی اہم کردار ادا کیا اور اُردو کو یہاں کی سرکاری

زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ بیرونی علاقوں خاص طور پر دلی اور گردونواح سے آئے ہوئے اہلِ علم نے یہاں مشاعروں کی بنا ڈالی جس سے عوام میں علمی و ادبی ذوق پیدا ہوا اور مقامی لوگوں میں سے ایسی شخصیات بھی سامنے آئیں جنہوں نے اُردو زبان میں گراں قدر ادبی کارنامے سرانجام دیئے۔ بقول حیات ترین:

''مقامی ادیبوں میں حضرت محسن مرحوم جیسے ریختی گو، آزاد جیسے غزل گو، لبید جیسے طنز گو اور سیف جیسے نعت گو پیدا ہوئے۔''(۱)

رفتہ رفتہ اُردو زبان یہاں اتنی مقبول ہوگئی کہ اس زبان میں عام ادبی ادب کے علاوہ صحافتی ادب نے بھی راہ پائی۔ چناں چہ لالۂ صحرا، محقق، اصلاح، ستلج، العزیز اور سخن ور جیسے رسائل و اخبارات منظر عام پر آئے۔ بہت سی علمی و ادبی مجالس اور حلقے قائم کیے گئے۔ اِن میں سے ایک ادبی حلقہ ''حلقۂ ذوق'' بھی تھا جس کے ممبران میں حیات ترین، محمود شمسی، دلشاد کلانچوی، شوق مینائی، نشتر غوری، علی رفعت، دیوی دیال آتش، طفیل اور واس دیو قمرہ شامل تھے۔ انہی حضرات میں سے ایک شخصیت حیات ترین نے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی جس کا نام انہوں نے ''عباسیہ اکادمی'' تجویز کیا۔ حیات ترین کے مطابق اس کے قیام کے دو بنیادی مقاصد تھے۔

''پہلا بیرون ریاست کے ادبی لٹریچر کو ریاست میں درآمد کر کے ادبی ماحول پیدا کرنا اور دوسرا خود ریاست میں موجود مقامی اور بیرونی ادیبوں کی کتابوں کی طباعت و اشاعت سے اُردو ادب کو فروغ دینا۔''(۲)

چناں چہ مقصدِ ثانی کے حصول کے لیے عباسیہ اکادمی جو پہلی کتاب منظر عام پر لائی وہ ''پریشان جلوے'' تھی جس کی تاریخِ اشاعت جولائی ۱۹۴۵ء درج ہے۔ اس کی کتابت شیخ محمد عبداللہ رنگین رقم لاہور نے کی تھی۔ جب کہ طباعت لائن پریس لاہور میں ہوئی اور اِسے ''عباسیہ اکادمی بغداد الجدید'' کے زیرِ اہتمام ۵۰۷ کی تعداد میں شائع کیا گیا۔ بدقسمتی سے اس کی اشاعت دوم نہ ہوسکی۔ اس لیے یہ کتاب اب نایاب ہے۔ ''پریشان جلوے'' قریباً اٹھائیس شعرا اور ادیبوں کی تخلیقات کا مجموعہ ہے۔

''پریشان جلوے'' دبستانِ بہاول پور کے حوالے سے خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اِسے ریاست بہاول پور میں شائع ہونے والے اوّلین تذکروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اِس کے متعلق ماجد قریشی لکھتے ہیں: ''ایک کتاب ''پریشان جلوے'' کے نام سے شائع بھی ہوئی تھی جس میں پاکستان کی تشکیل سے پیش تر کے کچھ ادبا و شعرا کے فن پارے اور ان کے حالات پر کچھ اشارے نظر آتے ہیں مگر وہ کتاب بھی آج کل نایاب ہے۔''(۳)

''پریشان جلوے'' کسی فردِ واحد کے قلم و فن کا شاہ کار نہیں بلکہ بہت سے اصحابِ قلم کے نتائجِ قلم کا شاخسانہ ہے۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق ریاست بہاول پور سے ہے جو یہاں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور حیاتِ فانی کی منزلیں عبور کرتے ہوئے اسی سرزمین میں مدفون ہوئے۔ کچھ ایسے اصحاب بھی ہیں جنہوں نے یہاں سے تعلیم و تربیت حاصل کی اور حصولِ روزگار کے لیے ہندوستان بھر میں پھیل گئے۔ ادب سے بھی وابستہ رہے اور نام کمایا۔ اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی،

شفیق الرحمٰن، امین حزیں اور شبیر بخاری قابلِ ذکر ہیں۔

''پریشان جلوے'' کی ترتیب میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شامل کی گئی تخلیق سے قبل اُس کے خالق کا مختصر تعارف دیا گیا ہے۔ تمام تخلیق کاروں کے تعارف کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کی اکثریت نوجوان تھی۔ چناں چہ اس کتاب میں شامل اُن کی تخلیقات کو اُن کی ابتدائی تخلیقات کہا جا سکتا ہے اور اس طرح اُن کے ابتدائی نظریۂ فن پر با آسانی بحث کی جا سکتی ہے۔

''پریشان جلوے'' کی نثری تخلیقات تین مضامین، گیارہ افسانوں اور ایک مزاحیہ داستان پر مشتمل ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں عباسیہ اکادمی بغداد الجدید کے مہتمم حبیب اللہ ترین کا تحریر کردہ ''تشکر'' درج ہے جس سے اِس کے لکھنے والے کی زبان و بیان پر مکمل دست رس کا پتا چلتا ہے۔ اگر چہ باوجود تلاش کے حبیب اللہ ترین کی کوئی بھی دوسری تحریر سامنے نہیں آ سکی لیکن اُن کی یہ مختصر تحریر اس بات کا عندیہ ضرور دیتی ہے کہ اُن میں ایک اچھے ادیب کی صلاحیتیں ضرور پنہاں تھیں۔ ''تشکر'' کے الفاظ اگر چہ مختصر ہیں لیکن انہیں جامع کہنا بے جا نہ ہوگا۔

''تعارف'' سر عبدالقادر کا تحریر کردہ مضمون ہے جو اُن کے مخصوص طرزِ نگارش کی عکاسی کرتا ہے۔ اِس مضمون میں انہوں نے جامع اور مدلل انداز میں ''پریشان جلوے'' کی تخلیقات پر تبصرہ کیا ہے۔ عصری رجحانات اور ''پریشان جلوے'' کی کہانیوں کا موازنہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''آج کل مختصر کہانیاں عموماً وہ پسند کی جاتی ہیں جن میں ترقی پسند ادب کے نمونوں کی تقلید کی جائے۔ بعض حسن و عشق میں جو حجاب پہلے زمانے کی تصانیف میں حائل تھا۔ اُس کو اٹھا دینے پر مائل ہیں اور بعض غریبوں کی حالتِ زار، مزدوروں کی بے بسی، امیروں کی بے وفائی اور عیش پرستی کے افسانے لکھ کر رفتہ رفتہ مزدوروں کو اُن کے حقوق سے آگاہ اور سرمایہ داروں کو اُن کی غفلت سے متنبہ کرنا چاہتے ہیں۔ اِن کہانیوں میں بھی یہی میلان غالب ہے۔'' (۴)

اپنے مضمون کے آخر میں سر عبدالقادر نے کرنل نذر علی شاہ کے افسانے ''اماں! پانی!!'' کے لیے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ریاست بہاول پور کے اہلِ قلم کو مقامی حالات و واقعات، رسوم و رواج اور خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی ترغیب دی ہے۔ توجیہہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: ''اِن مضامین کے پڑھنے والے دیکھ سکیں کہ ہمارا نیا بغداد صرف اپنی جغرافی حیثیت اور جغرافی خدوخال کے لحاظ سے عربستان اور بغداد قدیم سے مشابہت نہیں رکھتا بلکہ نئی ادبیات اور نئی معلومات کے لحاظ سے بھی نئے بغداد کے نام کی مناسبت روز بروز پیدا کر رہا ہے'' (۵)

''توضیح'' کے عنوان کے تحت حیات ترین نے ریاست بہاول پور کی تاریخ اور اُردو ادب کے ارتقاء پر جامع بحث کی ہے۔ اُن کا طرزِ نگارش پُر اثر اور حقیقت کی بھرپور عکاسی کرنے والا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''ریاست بہاول پور میں ادب کی تاریخ شاید اس کے ریگستانی قرطاس پر لکھی گئی تھی جو ہوا کی تندی سے آنکھ بچا کر ریت کے ذروں میں چھپ گئی ہے جس کا باوجود تلاش کے سراغ نہیں ملتا'' (۶)

''توضیح'' میں حیات ترین نے ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصے کو انہوں نے ''ادبی ادب'' جب کہ

دوسرے کو ''صحافتی ادب'' کا نام دیا ہے۔ ''صحافتی ادب'' کے ذریعے انہوں نے ریاست بہاول پور میں اُردو ادب کے ارتقاء میں صحافت کی خدمات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ اِس ضمن میں انہوں نے ریاست بہاول پور سے جاری ہونے والے تمام اخبارات ورسائل کا مختصر تذکرہ بھی کیا ہے۔ چناں چہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی یہ تحریر ریاست بہاول پور میں اُردو زبان وادب کے ارتقاء کے سلسلے میں ایک مستند حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔

''جان ایمان کی خیر'' احمد ندیم قاسمی کا تخلیق کردہ افسانہ ہے۔ اس سے قبل اُن کا افسانوی مجموعہ ''چوپال'' ۱۹۳۹ء میں منظرِ عام پر آچکا تھا۔ (۷) ''چوپال'' کے افسانوں کی طرح اس افسانے میں بھی دیہاتی رنگ جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہی رنگ بعد میں احمد ندیم قاسمی کی پہچان بن گیا اور سید وقار عظیم کو کہنا پڑا: ''یہ بات میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا کہ ندیم نے پنجاب کے دیہات کی کہانیاں لکھ کر ہمیں ان کے دلوں کا مکین اور ان کی دھڑکنوں کا ہم راز بنادیا ہے۔'' (۸) افسانہ ''جان ایمان کی خیر'' میں قاسمی صاحب نے کہانی کو ہیت، تکنیک اور ترتیب کی تثلیثی خوبیوں سے مزین کر کے پیش کیا ہے۔ اُن کی اس خوبی کے متعلق غافر شہزاد لکھتے ہیں: ''ندیم صاحب اپنے افسانوں میں ان تمام ممکنہ حدوں کو اس انداز سے چھوتے ہیں کہ قاری کی آنکھوں کے سامنے سے ایک ایک کر کے تمام پردے ہٹنے لگتے ہیں۔'' (۹) اس کہانی کی خوبی یہ ہے کہ اس کے کردار آج بھی ہمیں اپنے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ آج بھی اگر پرائمری سکول کا کم تنخواہ پانے والا استاد بیمار پڑ جائے تو معاشرے اور اہل وعیال کا رویہ اس کے ساتھ ویسا ہوگا جیسا قاسمی صاحب نے ۶۵ سال قبل اس کہانی میں پیش کر دیا تھا۔ اُن کی اسی حقیقت نگاری کے ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں: ''وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ اُن کی نظر بالعموم زندگی کی بنیادی صداقتوں اور لطافتوں پر رہتی ہے۔'' (۱۰) افسانے کا سب سے تلخ حصہ وہ ہے جہاں ہیڈ ماسٹر اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرتا ہے۔ یہاں ہیڈ ماسٹر طاقت ور طبقے کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے جو کمزور طبقے کی تذلیل کر کے روحانی خوشی محسوس کرتا ہے۔ قاسمی صاحب کے اسی بنیادی فلسفے کے متعلق ڈاکٹر شفیق انجم تحریر کرتے ہیں: ''احمد ندیم قاسمی کے موضوعات ترقی پسندوں کی اس بنیادی فکر سے ماخوذ ہیں جس کے مطابق معاشی ناانصافی اور طبقاتی جبر پر مبنی نظام تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ چناں چہ اسے بدل دینے ہی میں مسائل کا حل مضمر ہے۔'' (۱۱) ''جان ایمان کی خیر'' تکنیکی اور تاثراتی اعتبار سے ایک خوب صورت افسانہ ہے جو مصنف کے نظریات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

امین حزیں منفرد طرز اور ندرتِ خیال رکھنے والے ادیب ہیں۔ وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میں نے زندگی کو جس طرح ہے اسی طرح دیکھا ہے اور برداشت کیا ہے۔ میں اسے جنت بھی نہیں سمجھتا اور دوزخ بھی نہیں گردانتا ہوں۔ مجھ میں جو کمزوریاں ہیں اُن کے اظہار میں فخر نہیں سمجھتا ہوں اور جو اچھی باتیں ہیں اُن کے اظہار میں شرماتا نہیں ہوں۔'' (۱۲) انہوں نے اپنے افسانے ''محبت یا رحم'' کا تانا بانا دو کرداروں کے گرد بُنا ہے جو اس افسانے کے مرکزی کردار بھی ہیں۔ اِن کرداروں کے ہندوانہ ناموں کی بنا پر اس افسانے کو اگر تمثیل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مصنف نے ہیرو کے لیے ''پریم'' نام منتخب کیا ہے جو اپنے نام کی مناسبت سے پوری کہانی میں سراپا محبت نظر آتا ہے۔ جب کہ ہیروین کو ''دیوی'' کا نام دیا

ہے جو ہندوؤں کے ہاں شرم وحیا کی علامت تصور کی جاتی ہے۔یہی تاثر پورے افسانے میں دیوی نے قائم رکھا ہے۔اس افسانے میں مصنف نے کرداروں کی نفسیاتی کش مکش،قلبی کیفیت اور جذباتی ردِّعمل کو خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔اس افسانے کو مکمل رومانوی افسانہ کہا جاسکتا ہے۔

حیات ترین اپنے افسانے ''تحفہ'' سے قبل اپنے تعارف کے طور پر لکھتے ہیں:۔''میں اپنی زندگی میں بہت کم ہنسا ہوں۔میرا تبسم نامکمل اور میرے قہقہے ادھورے ہیں اور اپنی زندگی میں پوری طرح رو بھی نہیں سکا۔میرے آنسو ہمیشہ آنکھوں سے نکلتے ہی خشک ہو جاتے رہے۔کاش!میں ہنس سکتا۔کاش!میں رو سکتا۔''(۱۳)حیات ترین کی یہی داخلی کیفیت اُن کے افسانے کے مرکزی کردار الیاس پر چھائی نظر آتی ہے۔اگر چہ وہ بیماری سے نڈھال ہو چکا ہے پھر بھی گھر میں ہونے والی رونق اور نیلم کی حرکتوں پر قہقہے لگانا چاہتا ہے مگر ایک اَن جانا سا خوف اُس کے ہونٹوں کو سی لیتا ہے۔نیلم کی طرف سے دیا جانے والا تحفہ ایک پہیلی بن کر رہ جاتا ہے۔افسانے میں عورتوں کی نفسیات اور لڑکیوں کے رویے کی خوب عکاسی کی گئی ہے۔''تحفہ'' اصلاحی نوعیت کا افسانہ ہے جس کے ذریعے نوجوانوں میں خود داریٔ وطن کے لیے سرگرمِ عمل ہونے کا جذبہ بیدار کیا گیا ہے۔افسانے کا مرکزی کردار الیاس کہتا ہے:۔''میرے دل میں بھی ایک جذبہ ہے ماں!وطن کی خود داری کا۔بے حد گرم۔برف سے ڈھکا ہوا۔پہاڑی راستہ۔میرے کھولتے ہوئے خون کو منجمد نہیں کر سکتا''(۱۴)

''قصہ حاتم طائی بے تصویر''کیپٹن شفیق الرحمٰن کی تحریر کردہ مزاحیہ داستان ہے۔اسے حاتم طائی کی کہانیوں کی دل چسپ پیروڈی بھی کہا جاسکتا ہے۔شفیق الرحمٰن نے اپنی بے ساختگی اور اچھوتے پن کی بنا پر اسے اور زیادہ دل چسپ اور پُر مزاح بنا دیا ہے۔ضرب الامثال کے برمحل استعمال نے تحریر کی خوب صورتی میں اضافہ کر دیا ہے۔مثلاً:۔''چور تو بھاگ گیا اب یہ ہی سہی۔یہ ان بزرگ سیاہ پوش کی لنگوٹی ہے۔''(۱۵)مصنف نے اس تحریر میں ہماری روایتی داستانوں پر طنز کیا ہے جن میں ہیرو کو ہر مصیبت اور پریشانی سے سُرخ رو ہو کر نکلتے دکھایا جاتا ہے۔شفیق الرحمٰن نے طنز کو مزاح کے لبادے میں اس طرح پیش کیا ہے کہ نکلتے ہوئے کڑواہٹ کا ذرا بھر بھی احساس نہیں ہوتا۔اُن کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے حسن عسکری لکھتے ہیں:۔''سارے نئے ادب میں لے دے کر ایک شفیق الرحمٰن صاحب ہیں جنھوں نے تفریحی ادب کی طرف توجہ کی ہے۔یہ شگفتگی،یہ لاأبالی پن ،یہ مچلتی ہوئی جگ مگاہٹ بس اُنھی کا خاصہ ہے۔''(۱۶)

''کلرک کی عید''عطا محمد دلشاد کلانچوی کا تحریر کردہ افسانہ ہے جس میں غربت کی تلخیاں برداشت کرنے والے طبقے کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔دولت کی زیادتی جہاں انسان کو فرعون،نمرود،شداد اور قارون بنا دیتی ہے وہاں اس کی کمی بھی اُسے متشکک بنا دیتی ہے۔افسانے کا مرکزی کردار کہتا ہے:۔''پیسہ تو سب کچھ ہے۔زندگی،مسرت،سکون۔۔۔اور یہ چاند کا بخشا ہوا سکون بھی تو انھی کے لیے ہے جو پیسے والے ہیں جو دھن وان ہیں۔جن کے پاس غریبوں کا سکون گروی ہے۔شاید خدا بھی انھی پیسے والوں کے پاس پیام بھیجتا ہو اور ہم یونہی اپنے نام سمجھ لیتے ہیں۔ہم غریب کتنے خوش فہم ہوتے ہیں۔''(۱۷)مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مختلف تہواروں پر کی جانے والی بے جا نمود و نمائش غریب طبقے کو

احساسِ کم تری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ پلاٹ، آغاز وانجام اور تکنیکی اعتبار سے یہ عمدہ افسانہ ہے۔

''توبہ سے پہلے''علی احمد رفعت کا تخلیق کردہ افسانہ ہے۔اس میں بورژوا طبقے کی ایک جنس زدہ عورت کے خیالات کی عکاسی کی گئی ہے۔انسان رنگینیوں میں کتنا ہی مست کیوں نہ ہو احساسِ گناہ اُسے باطنی طور پر ضرور بے چین رکھتا ہے۔کچھ لوگ اس بے چینی سے نجات پانے کے لیے گناہوں سے تائب ہو جاتے ہیں۔جب کہ بعض لوگ خود کو مطمئن رکھنے کے لیے ''آخری گناہ'' کی گردان کرتے رہتے ہیں۔علی احمد رفعت کے اس افسانے میں ترقی پسند نظریات کی ترجمانی خوب کی گئی ہے۔

''انٹرویو'' پروفیسر محمد ساجد کا تحریر کردہ مزاحیہ افسانہ ہے۔ہمارے معاشرے میں ایسے کردار با کثرت پائے جاتے ہیں جو اپنی حرکتوں سے دوسروں کے لیے ظرافتِ طبع کا سامان کرتے رہتے ہیں۔افسانے کا مرکزی کردار ''بھیا جی'' بھی ایسی ہی ایک شخصیت ہے۔اُس کی الٹی سیدھی حرکتیں نہ صرف اُس کے لیے بلکہ اُس سے وابستہ دیگر لوگوں کے لیے بھی پریشانیوں کا موجب ہوتی ہیں۔''انٹرویو'' کو سادہ، ہلکا پھلکا اور پُر مزاح افسانہ کہا جا سکتا ہے۔

''تصور کی شرارت''میں نصر اللہ احسان الٰہی نے ایک لڑکی کے تصور کو موضوع بنایا ہے جو تصور میں کسی اور انسان کو کوئی اور سمجھ بیٹھتی ہے۔تصور کی وجہ سے جنم لینے والی غلط فہمی جس قسم کی صورتِ حال کا باعث بنتی ہے اُس کی عکاسی افسانے میں خوب صورت انداز میں کی گئی ہے۔''تصور کی شرارت'' رومانوی طرز کا خوب صورت افسانہ ہے۔

بریگیڈیئر نذیر علی شاہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ اہلِ سیف بھی تھے اور اہلِ قلم بھی۔اُن کے افسانے ''اماں! پانی!!'' کو سر عبدالقادر جیسی شخصیت نے سندِ قبولیت عطا فرمائی۔وہ لکھتے ہیں:۔''کرنل نذیر علی شاہ نے ایسا مضمون انتخاب کیا ہے جو خالص مقامی رنگ رکھتا ہے۔انہوں نے ایسی کہانی لکھی ہے جس میں موجودہ دورِ ترقی سے پہلے کے ریگستانی علاقے کی تصویر کھینچی ہے اور اب جو نمایاں فرق روز بروز ملک اور اہلِ ملک کی بہتری میں ہوتا جاتا ہے اس کو ایک دل آویز پیرائے میں دکھایا ہے۔''(۱۸) نذیر علی شاہ کا یہ افسانہ چولستان کی تہذیب، معاشرت، طرزِ زندگی اور رسوم ورواج کی عکاسی کرتی ہوئی خوب صورت تحریر ہے۔مصنف نے ریگستان، پیاس کی شدت، طوفانِ ریگ، ٹوبوں، جھوک، اونٹوں کی حرکات وسکنات اور لاشوں پر منڈلاتے ہوئے ریگستانی گِدھوں کا تذکرہ اس انداز میں کیا ہے کہ تمام واقعات قاری کو اپنی آنکھوں کے سامنے رونما ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔افسانے میں کرداروں کی باہمی کش مکش مصنف کی نفسیات شناسی کی مظہر ہے۔''قافلے والوں کو اس بات کا احساس کر کے انتہائی مسرت ہو رہی تھی کہ بدھو والوں کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا کہ اُن کے ٹوبے سے روہی کا ایک پیاسا قافلہ بے پانی پیے جا رہا ہے۔''(۱۹) افسانے کا پلاٹ، واقعات کی ترتیب اور اُتار چڑھاؤ جہاں مصنف کی فنکارانہ مہارت کے عکاس ہیں وہاں افسانے کا پُر امیدانہ اختتام اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔''نہریں کھدیں۔پانی آیا۔بحرِ ہند کے بخارات۔ہمالیہ کا برف۔ستلج کا پانی۔عظیماں۔عظیماں کے ماں باپ کا مدفن۔خاک آلود کھوپڑیاں۔اب پانی کی اس دریا دلی پر دُھل دُھلا کر ہنس رہی تھیں۔شاید اس لیے کہ آیندہ روہی میں اُن کی طرح کوئی پیاسا نہ مر سکے گا۔''(۲۰)

''شاہدہ''بقول نگہت جمال اُن کی ایک نہایت ہی پیاری سہیلی کی زندگی کی کہانی ہے۔اِس افسانے میں غالب کے قول کے مصداق عشق کو''آگ کا دریا'' ظاہر کیا گیا ہے جو اس دشت میں قدم رکھنے والے کا سب کچھ بھسم کر دیتا ہے۔لیکن حالات کبھی اس طرح بھی پلٹتے ہیں کہ وصل کی ایک ٹھنڈی پھوار انسان کے من سے احساسِ زیاں سلب کر کے اُسے خوشیوں سے ہم کنار کر دیتی ہے۔افسانہ رومانوی طرز کا ہے جس کا اختتام روایتی انداز میں کیا گیا ہے۔

نورالزماں احمد اوج کا افسانہ''یہ کتے''ترقی پسند ادب کی خوب ترجمانی کرتا ہے۔کارل مارکس کے بقول انسانوں میں دو

طبقے بن چکے ہیں۔ایک بورژوا(امیر طبقہ) اور دوسرا پرولتاریہ(غریب طبقہ)۔پہلا طبقہ نہ صرف دوسرے طبقے کے حقوق غصب کرتا ہے بلکہ اُس سے ذلت آمیز سلوک بھی روا رکھتا ہے۔(۲۱)برّصغیر کے اکثر علاقوں میں بھی ملازموں پر کتوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔اسی طبقاتی تفریق کو اس افسانے کا بنیادی موضوع بنایا گیا ہے۔طبقاتی تفریق ہمیشہ انسانی رویوں،طرزِ زندگی اور سوچ میں تلخیاں گھول دیتی ہے۔پھر انسان کی سوچ وہ ہو جاتی ہے جو اس افسانے کے مرکزی کردار کی ہے:۔''اور جس طرح کتوں میں راج کمار کے شکاری کتوں اور گلی کے آوارہ کتوں کی تقسیم کی گئی ہے۔شاید اس اُصول پر انسانوں میں بھی راج کمار اور اکبر کی سی تقسیم گئی ہے۔ایک غیر منصفانہ تقسیم۔''(۲۲)

''رقیب''محمود علی سمشی کا تحریر کردہ افسانہ ہے۔اس میں جذبۂ رقابت کو انوکھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔جذبۂ رقابت سے مغلوب ہو کر رقیب کی جان لے لینا قدیم طریقہ ہے۔لیکن اس افسانے میں جذبۂ رقابت کی مغلوبی کے سبب محبوب کی جان لینا دکھایا گیا ہے۔چناں چہ اس افسانے کو غیر روایتی کہا جا سکتا ہے۔اس کا انجام بھی غیر متوقع اور غیر حقیقی ہے:۔''دوسرے ہی دن سارے کمل نگر کی انگلیاں ہماری طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ہمارے ایک سے لباس۔ایک سے مذاق۔ایک سے تفریحی مشاغل اور چال ڈھال کی یک رنگی کو دیکھ کر سب لوگ کہتے تھے:۔''یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں یا رقیب!''(۲۳)واقعاتی جھول کے باوجود افسانہ نگار نے وحدتِ تاثر اور دل چسپی کو ابتدا سے انجام تک قائم رکھا ہے۔

''پس پردہ''کے عنوان کے تحت محمود سمشی کا تحریر کیا گیا مضمون''پریشان جلوے''کے تخلیق کاروں کی شخصیات پر فرداً فرداً مختصر تبصرہ ہے۔اس مضمون سے جہاں مصنف کی اعلیٰ قلمی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے وہاں اُن کی شخصیت شناسی کا پہلو بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے۔وہ احمد ندیم قاسمی کے متعلق تحریر کرتے ہیں:۔''قاسمی صاحب میں منطقیانہ ریاکاری کم اور جذباتی اخلاص زیادہ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ تو آپ سے محبت رکھتے ہیں۔لیکن آپ ہمیشہ اُن سے خائف رہتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ آپ اپنی زندگی کی دورُخی کے قائل ہیں۔''(۲۴)قاسمی صاحب کے سوانحی احوال کا غائر مطالعہ رکھنے والے اصحاب مضمون نگار کے اِن خیالات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔محمود سمشی لفظوں سے کھیلنے کا فن بھی خوب جانتے ہیں۔چناں چہ وہ الفاظ کے اُلٹ پھیر سے دل چسپ صورتِ حال پیدا کر دیتے ہیں۔وہ اختر علی منیر کے متعلق لکھتے ہیں:۔''آپ میں محبتِ زر کم اور زرِ محبت کی طلب زیادہ ہے۔''(۲۵)اسی طرح جلال الدین لبید کے متعلق تحریر کرتے ہیں:۔''لبید صاحب کا جاننا اپنے آپ پر

ظلم کرنے کے برابر ہے اور ظلم بھی ایسا جس کے خلاف کوئی اور آواز نہیں اٹھائی جا سکتی۔''(۲۶) اسی لفظی ہیر پھیر کی خوبی سے کام لیتے ہوئے وہ حیات ترین کے متعلق لکھتے ہیں:۔''ترین صاحب بہترین آدمی ہیں۔یہیں تک تو ہمیں اتفاق ہے۔لیکن ہمیں ترین صاحب کو انسان سمجھنے پر مجبور نہ کیا جائے۔کیوں کہ وہ اپنی سیرت کے لحاظ سے کسی مقرب فرشتے کے اوتار معلوم ہوتے ہیں۔''(۲۷) محمود شمسی کے اس مضمون میں برجستگی، شگفتگی، بے لاگ تبصرہ، طنز کی کاٹ اور مزاح کی چاشنی ایسی خوبیاں ہیں جو اسے ''پریشان جلوے'' کی دیگر تخلیقات میں نمایاں کرتی نظر آتی ہیں۔

''پریشان جلوے'' کی شعری تخلیقات میں گیارہ نظمیں، سات غزلیں، چوبیس قطعات اور دو سانیٹ طرز کی نظمیں شامل ہیں جس طرح ان تمام تخلیقات کے تخلیق کار مختلف ہیں اسی طرح ان کے طرزِ ادا، آہنگ، ہیت اور موضوعات بھی مختلف ہیں۔اِن تخلیق کاروں میں سے بعض آسمانِ شہرت کی بلندیوں پر پہنچے اور بعض کو اس قدر فراموش کر دیا گیا کہ تذکروں میں ان کا ذکر بھی مفقود ہے۔ذیل میں ہم ان کی تخلیقات کے ذریعے اُن کے فن کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔

دیوی دیال آتش نوجوان ہندو شاعر تھے جو قیامِ پاکستان کے بعد بھات چلے گئے۔''پریشان جلوے'' میں اُن کے پانچ قطعات شامل ہیں۔زمانے کی ناقدری، حالات کی نا آسودگی، غربت کی تلخیاں اور قوم کی پریشان حالی آتش کے خاص موضوعات ہیں۔اُن کا کلام ترقی پسندی کی طرف مائل ہے۔اِس کی تائید شہاب دہلوی یوں کرتے ہیں:۔''دیوی دیال آتش کی شاعری میں ترقی پسند رُجحانات ملتے ہیں۔''(۲۸) آتش کی ترقی پسندی ظاہری نعرہ بازی، انتشار و افتراق اور بغاوت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے بے نیاز ہے۔وہ امید و رجاء کا علم بردار ہے اور معاشرے میں امن دیکھنے کا خواہاں ہے۔امجد قریشی آتش کی اسی خوبی کے لیے رقم طراز ہیں:۔''آتش کی شاعری بلند بانگ دعووں، توڑ پھوڑ اور خون خرابے کی دعوتوں سے بے نیاز ہے۔وہ ایک حقیقت پسند رجائی شاعر ہے۔وہ وقتی طور پر افلاس اور ناداری سے ضرور گھبرا جاتا ہے۔مگر اس کے نزدیک اس کا علاج بغاوت اور فساد ہرگز نہیں۔''(۲۹) دیوی دیال آتش کے ہاں ہندو جاتی کا درد اور قوم پرستی بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

عبدالرحمٰن آزاد کا تعلق ایک شاعر خانوادے سے تھا۔اُن کی تخلیق کردہ ایک غزل ''پریشان جلوے'' میں شامل ہے۔اِس غزل کے مطالعے سے حیات میرٹھی کے اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ عبدالرحمٰن آزاد کو صنفِ غزل میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔(۳۰) سادگی، روانی اور تخیل کی گہرائی اُن کی شاعرانہ خصوصیات ہیں۔وہ دور از کار تشبیہات، استعارات اور ذو معنی لفاظی سے گریز کرتے ہیں۔آزاد کے طرزِ سخن کی تعریف کرتے ہوئے ماجد قریشی لکھتے ہیں:۔''آزاد کی شاعری میں نہ انوکھا پن ہے اور نہ ہی کوئی تعلّی، وارداتِ قلبی کو شعر کا جامہ پہنا دینا ہی آزاد کی شاعری ہے اور اِس میں وہ بہت حد تک کامیاب ہیں۔''(۳۱) اُن کی غزل کا یہ شعر سادگی اور طرزِ ادا کی خوب صورتی کا نمونہ ہے۔

عجب وقتِ رخصت تھا حسرت کا منظر
کہا ''جا رہے ہو؟'' کہا ''جا رہا ہوں'' (۳۲)

آزاد کی شعری خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے شہاب دہلوی لکھتے ہیں: ''فنِ شعر کی باریکیاں پوری طرح نظر میں تھیں۔ زبان و بیان پر قدرت تھی۔ سوچ سمجھ کر شعر کہتے تھے۔ فرسودہ مضامین میں بھی اپنے طرزِ ادا سے خوب تازگی پیدا کر دیتے تھے۔''(۳۳)

شمس الحسن اختر صدیقی حکمت (طب) کے پیشے سے منسلک تھے۔ اُن کی شاعری اصلاح پسندانہ اور تبلیغی جذبے سے بھرپور ہے۔ وہ معاشرے کو برائیوں سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک خیر و شر ازل سے برسرِ پیکار ہیں اور شر کی ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ اہلِ حق کو صراطِ مستقیم سے بھٹکا دے۔ اختر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ماجد قریشی لکھتے ہیں: ''اُن کے ہاں سر سید کی تحریکِ اصلاحات، ترقی پسندانہ تحریک اور رجعت پسندانہ خیالات کا امتزاج ملتا ہے۔''(۳۴) ''پریشان جلوے'' میں شامل اختر کی نظم ''شیطان کا فرمان'' کو علامہ اقبال کی نظم کا چربہ یا پیروڈی کہا جا سکتا ہے۔ یہ معاملہ ماجد قریشی کو بہت کھٹکتا ہے وہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اِس میں شک نہیں کہ اِن شاعروں نے اقبال کی شہرت سے متاثر ہو کر اس کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس تقلید میں نقل صرف نقل بن کر رہ گئی ہے۔ اُن کی شاعری میں اقبال جیسا ترنم، اقبال جیسی شدت، اقبال کا سا جوش، اقبال جیسا فلسفیانہ رچاؤ اور اقبال کی سی قومی نمائندگی کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی بلکہ اس کے برعکس یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اقبال کے فلسفے اور خلوص کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی گئی ہے۔''(۳۵)

احمد خان اکمل کی ایک نظم اور دو قطعات ''پریشان جلوے'' میں شامل ہیں۔ اکمل کے ہاں ہمیں لفظی بازی گری تو نظر آتی ہے مگر خیالات کی گہرائی، جدت اور مضامین میں تنوع نظر نہیں آتا۔ بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ اکمل نے بھی اختر کی طرح اقبال کے بیان کردہ مضامین پر طبع آزمائی کی ہے۔ اسی سلسلے میں ماجد قریشی لکھتے ہیں: ''صرف ایک اختر ہی پر موقوف نہیں۔ اُن کے ہم عصروں اور ہم خیال افراد نے اقبال، حالی اور سر سید کے چبائے ہوئے لقموں پر اکتفا کیا ہے اور متحدہ ہند کے شاعروں نے شاعری کو جس عروج تک پہنچا دیا تھا۔ اُس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ اکمل، دلشاد، شہید اور فاروق کے ہاں اقبال کا چربہ بڑی شدت سے کھٹکتا ہے۔''(۳۶)

معین الدین حاوی کی تخلیق کردہ ایک غزل ''پریشان جلوے'' میں شامل ہے۔ غزل میں غالب کا اثر اور رنگ نمایاں ہے۔ حاوی فارسی اور عربی کے بلند پایہ عالم تھے۔ وہ قدیم روایاتِ شاعری کے پاس دار تھے۔ اُن کے کلام میں علمی گہرائی انہیں سطحی اور جذباتی خیالات کی ترجمانی سے روکتی نظر آتی ہے۔ اِس غزل میں بھی اُنہوں نے وحدت و کثرت کے فلسفے کو پیش کیا ہے۔ اِس بنا پر ماجد قریشی نے انہیں ''صوفی شاعر'' کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''صوفیانہ شاعری حاوی صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔ مگر جب صوفیوں کا دور ہی نہ رہا تو آپ کی شاعری کی قدر کون کرے گا؟''(۳۷) شہاب دہلوی بھی ماجد قریشی کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''روحانیت اور تصوف اُن کے خاص موضوع ہیں۔ اشعار میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے۔''(۳۸)

حبیب اللہ شاہ حبیب کی تخلیق کردہ نظم بعنوان ''لارنس گارڈن کی شام'' پریشان جلوے میں شامل ہے۔حبیب کو منظر نگاری میں کمال حاصل ہے۔اُس کی شاعری میں الفاظ کی ادائیگی اور ترنم بے مثال ہے۔وہ حقیقت پسند شاعر ہے اور ہر بُری بات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔حبیب کی شاعری پر مقصدیت کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔چناں چہ ماجد قریشی لکھتے ہیں:۔''سرسید کی تحریکِ اصلاحات کی صدائے بازگشت حبیب تلونڈوی کے ہاں ملتی ہے۔وہ ذہنی طور پر ایک مسلمان شاعر ہے۔اُسے مسلمانوں کی مذہب سے کنارہ کشی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔''(۳۹)اگر حبیب کو اکبر الہ آبادی کی پیروی کرنے والا شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔حبیب کی اس نظم کے آخری شعر میں اکبر کی نظم ''لندن میں عقد'' کی بازگشت واضح سنائی دیتی ہے۔اکبر نے اپنی نظم میں تہذیب جدید پر طنز کیا ہے اور یہی طنز حبیب کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔

تہذیبِ نو پہ قدرت آنسو بہا رہی تھی
معصومیت کی دیوی شرمائے جا رہی تھی(۴۰)

اکبر الہ آبادی کی پیروی کا اعتراف کرتے ہوئے حبیب لکھتے ہیں:۔''میرا ادبی ذوق اور شعری رجحان زیادہ تر حضرت جوش ملیح آبادی،حضرت اکبر الہ آبادی(مرحوم)اور حضرت حکیم الامت علامہ اقبال(مرحوم)کی طرف مائل ہے۔''(۴۱)

بال کرشن حقیر کے تین قطعات ''پریشان جلوے'' میں شامل ہیں۔اِن قطعات کے مطالعہ سے شہاب دہلوی کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ قوم پرست ہندو شاعر تھے۔(۴۲)حقیر اپنے کلام میں انسانی معاشرے کی مٹتی ہوئی اقدار اور بڑھتی ہوئی افراتفری سے خائف نظر آتا ہے۔اُس کے کلام میں کہیں کہیں یاسیت کے سائے بھی نظر آتے ہیں جس کا سبب قومی بدحالی ہے۔وہ لکھتے ہیں:۔

اب قوم کی رسوائیاں دیکھی نہیں جاتیں
ایسے میں مجھے کاش!کوئی زہر پلا دے (۴۳)

حقیر کی اصلاح پسندی کی تصدیق کرتے ہوئے ماجد قریشی لکھتے ہیں:۔''حقیر قوم کی بے حسی اور بے ایمانی کو بے نقاب کرنے میں پیش پیش ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ قوم کو مٹانے کے لیے پھوٹ اور انتشار زہر قاتل ثابت ہوتے ہیں۔''(۴۴)

دلشاد کلانچوی جہاں کہنہ مشق ادیب اور محقق تھے وہاں اُن کے ابتدائی دور میں شاعر ہونے کا پتا بھی چلتا ہے۔لیکن بعد میں اُنہوں نے شاعری ترک کر دی اور نثر کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔(۴۵)دلشاد کلانچوی کے تخلیق کردہ ایک سانیٹ طرز نظم،ایک غزل اور تین قطعات ''پریشان جلوے'' کی زینت بنے ہیں۔دلشاد کے کلام میں زندگی کی تلخیوں،تہذیب کی خستہ حالی اور بگڑتی ہوئی معاشرتی اقدار کا نوحہ نمایاں نظر آتا ہے۔وہ ظلم،غرور،بے حسی،بے غیرتی،مغربی روایات کی بے جا تقلید اور تعمیر کے نام پر ہونے والی تخریب کا سخت مخالف ہے۔وہ معاشرے میں مساوات اور برابری کا قائل ہے۔ہمیں دلشاد کے ہاں

مضامین کا فقدان نظر آتا ہے۔اُس نے اپنی شاعری کی بنیاد اقبال کے افکار پر رکھی ہے۔جب کہ ماجد قریشی اُس کی شاعری کو اقبال کا چربہ قرار دیتے ہیں۔(۴۶)

علی احمد رفعت بنیادی طور پر صحافی اور افسانہ نگار تھے۔لیکن اُن کی پہچان باحیثیتِ شاعر بھی ہے۔شہاب دہلوی لکھتے ہیں:۔''اگر چہ انہوں نے شاعری کی طرف کم توجہ دی ہے۔تاہم جو کچھ کہا ہے وہ خاصا معیاری ہے اور باحیثیت شاعر اُن کا نام زندہ رہے گا۔''(۴۷)رفعت کی ایک آزاد نظم''پیغام''پریشان جلوے میں شامل ہے۔رفعت کے ہاں تخیل کی گہرائی اور الفاظ کی عمدگی نمایاں نظر آتی ہیں اور وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر بھی ہے۔اُس کے ہاں تلخیٔ حالات کو ہنس کر پینے کی بجائے انتقام لینا ہی عزت وشرف کی علامت ہے۔وہ لکھتا ہے:۔

بحر کی سوئی ہوئی موجوں میں طوفاں بھر دو
ایک سو سال کی ذلت کا مداوا کر دو (۴۸)

علی احمد رفعت کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ماجد قریشی لکھتے ہیں:۔''رفعت کی مترنم،متحرک،رقصاں اور شرر بار شاعری میں گہرا سیاسی شعور نظر آتا ہے۔''(۴۹)

محی الدین شان کی تخلیق کردہ ایک غزل اور دو قطعات''پریشان جلوے''کی زینت بنے ہیں۔شان کی شاعری کے متعلق ماجد قریشی لکھتے ہیں:۔''شان اپنی طبیعت کی گونا گونی اور سیمابیت کے سبب کسی ایک مقام پر مقیم نہیں ہو سکتے۔وہ نہ تو روایت پسندی کا شکار ہو سکتے ہیں اور نہ ترقی پسندی کے غلام''(۵۰)شہاب دہلوی کے نزدیک''شان پختہ فکر اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ان کی شاعری ذاتی تجربات اور مشاہدات کی آئینہ دار تھی جس میں اُن کے اپنے غم وافکار کی جھلک ملتی ہے۔زبان و بیان پر پوری گرفت تھی۔''(۵۱)

غلام شبیر بخاری کی ایک غزل،ایک نظم''نوائے جرس''اور تین قطعات''پریشان''جلوے میں شامل ہیں۔شبیر بخاری عملی طور پر مدرس تھے اور یہی تدریسی انداز اُن کی شاعری پر چھایا ہوا ہے۔اُن کے اشعار قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔شبیر کی شاعری پر رجائیت کا سایہ ہے۔وہ قوم کے مستقبل سے پُر امید نظر آتا ہے۔شبیر کی رجائیت پسندی کے متعلق ماجد قریشی لکھتے ہیں:۔''شبیر کی رجائیت اُس کی عظمت کی علامت ہے۔مایوس ہونا اُس کے مذہب میں گناہِ عظیم ہے۔وہ جہاں کہیں بھی ہو جس حالت میں بھی ہو ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کا جذبہ اُس کے دل میں یکساں کارفرما رہتا ہے۔وہ عظیم شاعر ہو نہ ہو عظیم انسان ضرور ہے۔''(۵۲)شبیر بخاری کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قومی درد اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔وہ اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں اور اُن کی شاعری پر اقبال کا رنگ چھایا ہوا ہے۔اس سلسلے میں مسعود حسن شہاب یوں لکھتے ہیں:۔''حقیقت میں سید غلام شبیر بخاری اُن لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے نئی پود کو اقبال کے پیغام سے آشنا کیا۔اپنی شاعری کو فکرِ اقبال سے ہم آہنگ کر کے یہاں کے لوگوں کو اقبال شناسی سے بہرہ ور کیا۔''(۵۳)

محمود علی شمسی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ''پریشان جلوے''میں سب سے زیادہ اُن کی تخلیقات شامل ہیں۔شعری

تخلیقات میں اُن کی دو نظمیں ،ایک سانیٹ اور ایک غزل شامل ہیں۔محمود شمسی جو پہلے افسوں تخلص کرتے تھے اپنے کلام میں ہمہ رنگ شاعر نظر آتے ہیں۔اُن کے ہاں رومانویت کے ساتھ ساتھ ترقی پسند عناصر بھی موجود ہیں۔اُن کا تصور اور تخیل تمام کلام پر چھایا نظر آتا ہے جو اُنہیں خارج سے بے گانہ بنا دیتا ہے۔یہ معاملہ اُن کے ہاں خوبی ہونے کے باوجود خامی بن کر کھٹکتا نظر آتا ہے۔چناں چہ ماجد قریشی لکھتے ہیں:۔''رومانیت کی چاشنی افسوں کو تصوریت سے باہر نہیں آنے دیتی اور وہ سیاست عالم کا شعور رکھنے کے باوجود اپنے اردگرد رومان کے ایسے جال بنتا رہتا ہے جس میں خود ہی اُلجھ جاتا ہے۔اِس طرح افسوں کی شاعری انتہائی ترقی پسندانہ ہونے کے باوجود بے روح نظر آنے لگتی ہے۔''(۵۴)

حکیم عبدالحق شوق کی ایک غزل ''پریشان جلوے'' کے صفحات کی زینت بنی ہے۔شوق کی شاعری سے متعلق شہاب دہلوی لکھتے ہیں:۔''شاعری میں اُن کا ایک منفرد مقام ہے۔جذبوں کی سچائی اور خلوص اُن کی شاعری کی جان اور سلاستِ بیان اُن کے فن کی شناخت ہے۔''(۵۵)شوق کی شاعری میں جہاں ماحول کی تلخیاں،سامراجی نظام کی ناہمواریاں اور رومانیت پرستی نمایاں نظر آتی ہیں وہاں وہ زندگی سے فرار حاصل کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔وہ ایسے حساس شاعر ہیں جس نے غزل کو اپنے خونِ جگر سے کشید کیا ہے۔ماجد قریشی شوق کے متعلق یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:۔''شوق غزل کے شاعر تھے۔انہوں نے غزل کے پردے میں اپنا خونِ جگر پیش کیا ہے۔انہوں نے عام روایات کے مطابق محض گل و بلبل اور زلف ورُخسار کو جنسیاتی رنگ میں پیش نہیں کیا بلکہ یہ تمام باتیں اِن کے ہاں علامتیں بن گئی ہیں۔''(۵۶)

نواز شہید کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے کچھ عرصہ موزونیٔ طبع کی بنا پر یا صحبتِ اہلِ سخن کی وجہ سے شاعری کی ہے۔مگر جب صحبت تبدیل ہوئی تو سب کچھ چھوڑ کر روزمرہ مشغولیات میں مگن ہو گئے۔اِس لیے اُس دور کے لکھے گئے تمام تذکرے اُن کے ذکر سے خالی ہیں۔نواز شہید کی ایک نظم،ایک غزل اور ایک رباعی ''پریشان جلوے'' میں شامل ہیں۔اُن کے کلام کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اُنہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ترنم،روانی،شگفتگی اور تراکیب کا موزوں استعمال اُن کی نمایاں خصوصیات ہیں۔اُن کے کلام میں کائنات کے اسرار و رموز کا بیان اور تہذیبِ مغرب سے نفرت نمایاں نظر آتے ہیں۔ماجد قریشی ان کے کلام کو اقبال کی پیروی اور چربہ قرار دیتے ہیں۔(۵۷)

مرزا محمد سیف اللہ فاروق کی ایک نظم ''کسی سے خطاب'' پریشان جلوے کے صفحات کی زینت بنی ہے۔فاروق کی یہ نظم اقبال کی نظم ''عبدالقادر کے نام'' کی طرز اور آہنگ میں لکھی ہوئی ہے۔فاروق کے کلام پر اقبال کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔اس بنا پر ماجد قریشی کا یہ دعویٰ سچ نظر آتا ہے:۔''فاروق کے ہاں اقبال کا چربہ بڑی شدت سے کھٹکتا ہے۔''(۵۸)

جلال الدین لبید طبعاً واعظ و مبلغ تھے۔اُن کا جذبۂ تبلیغ اُن کی شاعری میں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔اُن کے تین قطعات ''پریشان جلوے'' میں شامل ہیں جن میں دورِ جدید میں بڑھتی ہوئی فحاشی،فیشن پرستی اور مادر پدر آزادی کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔اُن کی شاعری پر اکبر الہ آبادی کا رنگ غالب ہے۔شہاب دہلوی لکھتے ہیں:۔''جس طرح مولوی عزیز الرحمٰن نے مولانا حالی کے رنگ کو اپنا کر ان کی نمائندگی کا حق ادا کیا ہے۔اسی طرح جلال الدین لبید،اکبر الہ آبادی کے پیروکار تھے اور اُن

کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔''(۵۹)

اختر علی منیر کی نظم ''طلسمِ آرزو'' پریشان جلوے کے صفحات کی زینت بنی ہے۔منیر ایک کہنہ مشق نظم گو شاعر نظر آتا ہے۔اُس کے ہاں خارجیت سے زیادہ داخلیت کا زور ہے۔وہ الفاظ کو مناسب انداز میں استعمال کرنا خوب جانتا ہے۔منیر کی شاعری ہمدردی کے جذبے سے بھرپور ہے۔ماجد قریشی لکھتے ہیں:۔''اختر منیر کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت مظلوم سے ہمدردی کا جذبہ ہے۔خواہ استعارہ گل سے ہو یا بلبل سے مقصد ہمدردی ہی رہتا ہے۔''(۶۰) یہی ہمدردی کا جذبہ منیر کی نظم ''طلسمِ آرزو'' میں بھی نظر آتا ہے۔وہ اُن معصوم بچوں سے ہمدردی کرتا دکھائی دیتا ہے جو کم سنی میں چاند کو پا لینے کی آرزو کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شجاع ناموس کا شمار بہاول پور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اہلِ قلم میں ہوتا تھا۔اُن کی نظم ''خیالات کے طوفان'' پریشان جلوے میں شامل ہے۔اُن کے کلام میں علم کی گہرائی اور فلسفے کی چاشنی واضح محسوس کی جاسکتی ہے۔علم کی گہرائی کا اعتراف کرتے ہوئے ماجد قریشی لکھتے ہیں:۔''ڈاکٹر ناموس کے معاملے میں ہمیں اعتراف ہے کہ اُن کی مسلسل مطالعہ کی عادت نے اُنہیں علم کی گہرائی عطا کی ہے اور وہ عام لوگوں سے مختلف انداز میں سوچتے اور منفرد انداز میں لکھتے ہیں۔''(۶۱) ڈاکٹر ناموس اقبال سے بڑی حد تک متاثر تھے اور اُن کی شاعری پر بھی اقبالی رنگ غالب ہے۔سر عبدالقادر لکھتے ہیں:۔''اپنی طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر ناموس کو علامہ اقبال مرحوم کا فیضِ صحبت نصیب ہوا ہے اور اسی سبب سے اُن کے اشعار میں اقبال کے رنگ کی جھلک ہے۔''(۶۲) ڈاکٹر ناموس پر اقبال کے اثر سے متعلق شہاب دہلوی لکھتے ہیں:۔

''علامہ اقبال کے صحبت یافتہ تھے اور خود کو علامہ کے رنگ میں ایسا ڈھال لیا تھا کہ نہ صرف شاعری میں اُن کی جھلک نظر آتی ہے بلکہ وضع قطع میں اقبال ثانی معلوم ہوتے تھے۔''(۶۳)

شعری تخلیقات میں احمد ندیم قاسمی کی ایک غزل،ایک نظم ''سوانگ'' اور تین قطعات شامل ہیں۔ندیم کی شاعری سادگی کا مرقع ہے۔وہ الفاظ کے پیچ وخم میں الجھنے سے گریز کرتے ہیں۔اُن کی اس خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:۔''ندیم کا اسلوب سیدھا سادہ اور انداز صاف وسلیس ہے۔ان کے یہاں بعض دوسرے شاعروں کی طرح پیچیدگی اور ابہام کے پہلو نظر نہیں آتے۔اُن کے یہاں تو سیدھے سادے انداز میں بات کہنے کا سلیقہ ہے۔''(۶۴) احمد ندیم قاسمی طویل عرصہ تک ترقی پسند تحریک کا حصہ رہے۔اس لیے اُن کے کلام میں ترقی پسندگی کی گونج واضح سنائی دیتی ہے۔صابر حسین لکھتے ہیں:۔''ندیم صاحب ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور ابھی تک اس کے منشور پر عمل پیرا ہیں اور معاشرے کو جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی لوٹ کھسوٹ اور طبقاتی استحصال سے پاک کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''(۶۵)

حوالہ جات

۱۔ حیات ترین: ''توضیح''، مشمولہ پریشان جلوے، بغداد الجدید اکیڈمی بہاول پور، ۱۹۴۵ء، ص ۹

۲۔ ایضاً، ص ۱۱

۳۔ ماجد قریشی: نقوش رفتگاں، ادارہ مطبوعاتِ آفتابِ مشرق، بہاول پور، ۱۹۶۲ء، ص ۶

۴۔ عبدالقادر، سر: ''تعارف''، مشمولہ پریشان جلوے، ص ۴

۵۔ ایضاً، ص ۵

۶۔ حیات ترین: ''توضیح''، مشمولہ پریشان جلوے، ص ۶

۷۔ غافر شہزاد: ندیم کے افسانوی کردار، ادراک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰

۸۔ وقار عظیم، سید: دیباچہ سناٹا، اساطیر، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۹

۹۔ غافر شہزاد: ندیم کے افسانوی کردار، ص ۱۲

۱۰۔ فرمان فتح پوری: ڈاکٹر، اُردو افسانہ اور افسانہ نگار، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۲۴۱

۱۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر: اُردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۶

۱۲۔ امین حزیں: ''تعارف''، مشمولہ پریشان جلوے، ص ۳۴

۱۳۔ حیات ترین: ''تعارف''، مشمولہ پریشان جلوے، ص ۴۵

۱۴۔ حیات ترین: ''تحفہ''، مشمولہ پریشان جلوے، ص ۵۹

۱۵۔ شفیق الرحمٰن، کیپٹن: ''قصہ حاتم طائی بے تصویر''، مشمولہ پریشان جلوے، ص ۶۳

۱۶۔ شفیق الرحمٰن، کیپٹن: دریچے، ماورا پبلشرز، لاہور، اپریل ۱۹۹۱ء، فلیپ

۱۷۔ دلشاد کلانچوی: ''کلرک کی عید''، مشمولہ پریشان جلوے، ص ۸۶

۱۸۔ عبدالقادر، سر: ''تعارف''، مشمولہ پریشان جلوے، ص ۵

۱۹۔ نذیر علی شاہ، برگیڈیئر: ''اماں! پانی!!''، مشمولہ پریشان جلوے، ص ۱۳۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۲۱۔ Marx, Caral: Comunist Menifestov, The Books, Eden Squar, London, 1976, page16

۲۲۔ اوج، نورالزماں احمد: ''یہ کتے''، مشمولہ پریشان جلوے، ص ۱۶۶

۲۳۔ محمود علی شمسی: ''رقیب''، مشمولہ پریشان جلوے، ص ۱۸۴

۲۴۔ محمود علی شمسی: ''پسِ پردہ''، مشمولہ پریشان جلوے، ص ۲۲۵

۲۵۔ ایضاً ص ۲۲۶ ۲۶۔ ایضاً ص ۲۲۷

۲۷۔ ایضاً ص ۲۲۹

۲۸۔ شہاب حسن دہلوی: بہاول پور میں اُردو، اُردو اکیڈمی، بہاول پور، ۱۹۸۳ء، ص ۲۰۱

۲۹۔ ماجد قریشی: دبستانِ بہاول پور، ادارہ مطبوعاتِ آفتابِ مشرق، بہاول پور، اگست ۱۹۶۵ء، ص ۲۲۹

۳۰۔ حیات میرٹھی: بہاول پور کا شعری ادب، اُردو اکیڈمی، بہاول پور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۰۶

۳۱۔ ماجد قریشی: دبستانِ بہاول پور، ص ۱۹۱

۳۲۔ حیات ترین: پریشان جلوے، ص ۱۸۹

۳۳۔ شہاب حسن دہلوی: بہاول پور میں اُردو، ص ۲۶۷

۳۴۔ ماجد قریشی: دبستانِ بہاول پور، ص ۱۵۹

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۶۲ ۳۶۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۱۲

۳۸۔ شہاب حسن دہلوی: بہاول پور میں اُردو، ص ۲۶۵

۳۹۔ ماجد قریشی: دبستانِ بہاول پور، ص ۲۴۵

۴۰۔ حیات ترین: پریشان جلوے، ص ۱۹۵

۴۱۔ حیات میرٹھی: بہاول پور کا شعری ادب، ص ۵۰۰

۴۲۔ شہاب حسن دہلوی: بہاول پور میں اُردو، ص ۲۰۱

۴۳۔ ماجد قریشی: دبستانِ بہاول پور، ص ۲۴۵

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۴۴

۴۵۔ شوکت مغل: دلشاد کلانچوی شخصیت اور فن، اکادمی سرائیکی ادب بہاول پور، مئی ۲۰۰۴ء، ص ۱۲

۴۶۔ ماجد قریشی: دبستانِ بہاول پور، ص ۱۶۱

۴۷۔ شہاب حسن دہلوی: بہاول پور میں اُردو، ص ۲۶۴

۴۸۔ حیات ترین: پریشان جلوے، ص ۲۰۰

۴۹۔ ماجد قریشی: دبستانِ بہاول پور، ص ۲۱۶

۵۰۔ ایضاً، ص ۲۰۸

۵۱۔ شہاب حسن دہلوی: بہاول پور میں اُردو، ص ۲۶۶

۵۲۔ ماجد قریشی: دبستانِ بہاول پور، ص ۲۲۶

۵۳۔ شہاب حسن دہلوی: بہاول پور میں اُردو، ص۲۶۰

۵۴۔ ماجد قریشی: دبستانِ بہاول پور، ص۱۶۴

۵۵۔ شہاب حسن دہلوی: بہاول پور میں اُردو، ص۲۵۷

۵۶۔ ماجد قریشی: دبستانِ بہاول پور، ص۱۷۵

۵۷۔ ایضاً، ص۱۶۱ ۵۸۔ ایضاً، ص۱۶۱

۵۹۔ شہاب حسن دہلوی: بہاول پور میں اُردو، ص۲۵۴

۶۰۔ ماجد قریشی: دبستانِ بہاول پور، ص۲۵۳ ۶۱۔ ایضاً، ص۲۰۲

۶۲۔ عبدالقادر، سر: تقریظ، صبحِ ازل، مکتبہ دارالادب، بہاول پور، ۱۹۴۹ء، ص۵

۶۳۔ شہاب حسن دہلوی: بہاول پور میں اُردو، ص۲۶۱

۶۴۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر: ''احمد ندیم قاسمی کی شاعری'' ندیم نامہ، مجلس اربابِ فن، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص۲۳۷

۶۵۔ صابر حسین: احمد ندیم قاسمی بحیثیت غزل گو شاعر، مقالہ برائے ایم۔اے اُردو، اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور، ۱۹۹۱ء، ص۲۰۴